فروغِ عربی زبان و ادب
(مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی کاوشوں کا جائزہ)

محمد سرفراز خالد*

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ (۱۹۱۳ء۔۱۹۹۹ء) کا شمار برصغیر پاک و ہند کے نامور علماء دین میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی دینی علوم کی درس و تدریس اور عربی زبان کی ترویج و اشاعت میں صرف کی۔ عرب و عجم میں ان کی خدمات کو تسلیم کیا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ عرب نے جب عربی زبان و ادب کے نامور افراد پر مشتمل ایک مؤثر تنظیم ''رابطہ ادب اسلامی'' کی تشکیل کا ارادہ کیا تو اس تنظیم کی سربراہی کے لیے مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے گذارش کی گئی۔ انہوں نے اس پیشکش کو قبول فرمایا اور تاحیات اس کے صدر نشیں رہے۔

عربی ماحول میں پرورش:

سید ابوالحسن علی ندوی کی ولادت لکھنؤ شہر میں نامور ادبی و علمی شخصیت حکیم مولانا سید عبدالحی لکھنویؒ کے ہاں ہوئی، جن کا اکثر وقت مطب میں علاج معالجہ کے علاوہ ندوۃ العلماء کی نظامت کے کاموں میں صرف ہوتا۔ جہاں انہیں تحریر و تصنیف کے مواقع بھی میسر آ جاتے۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ عمّان میں منعقدہ ایک بین الاقوامی سیمینار میں شرکت کے موقع پر اپنے خطاب بعنوان ''ہندوستان میں مسلمان اور ان کا تاریخی کردار'' میں دیگر اکابرین برصغیر پاک و ہند کی مساعی جمیلہ کا تذکرہ کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے والد گرامی کی خدمات کے اعتراف میں یوں بیان کرتے ہیں:

> ''ہندوستان کی مختلف پہلوؤں سے اسلامی تاریخ کے سلسلہ میں والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ کی عربی تصانیف کا ذکر کیا۔ جن میں سے ہندوستان میں اسلامی علوم و فنون کی تاریخ اور علمائے ہند کی تصنیفات کی ڈائرکٹری ''الثقافة الاسلاميه فی الهند'' کے نام سے دمشق کی مشہور و موقر سرکاری اکیڈیمی ''المجمع العلمی العربی'' (حال: مجمع اللغۃ العربیۃ) کی طرف سے شائع ہو چکی ہے۔''(۱)

آپ کی والدہ سیدہ خیر النساء، حفظ القرآن کی دولت سے فیضیاب ہونے کے ساتھ ساتھ شعر و نثر کی کئی کتابوں کی مصنفہ تھیں۔ علاوہ ازیں ان کے گھرانے کے دیگر بہت سے افراد تصنیف و تالیف میں شہرت رکھتے تھے۔ اس علمی ماحول میں مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے پرورش پائی۔ مذہبی گھرانہ ہونے کی وجہ سے قرآن و سنت کی

* اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ عربی و علومِ اسلامیہ، جی سی یونیورسٹی لاہور، پاکستان

تدریس اور عربی زبان کی تعلیم پر بھرپور توجہ دی جاتی تھی۔ حسب روایت مولانا کی تعلیم وتربیت میں بھی اس کا خصوصی اہتمام کیا گیا۔ خوش قسمتی سے انہیں بچپن میں ہی ایک عرب استاذ شیخ محمد بن خلیل سے عربی سیکھنے کا موقع میسر آیا جس کا اظہار مولانا ابوالحسن ندویؒ نے اِن الفاظ میں کیا ہے:

''بھائی صاحب نے جب عرب صاحب سے مجھے عربی شروع کرانے کو کہا تو انہوں نے ایک دن کاپی پر ماضی کی گردان ''فَعَلَ، فَعَلَا، فَعَلُوا'' لکھ کر دی اور کہا کہ یاد کر کے لے آؤ۔ اس کے چند دن بعد ہی انہوں نے اپنی محبوب نصابی کتاب ''المطالعة العربية'' شروع کرا دی، اس وقت عرب صاحب بازار جھاؤ لال کی اسی گلی میں ایک چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے، اور لکھنؤ یونیورسٹی میں عربی کے استاد تھے۔'' (۲)

عرب استاد نے انہیں عربی لکھنے پڑھنے کے ساتھ ساتھ بول چال کی طرف بھی خصوصی توجہ دلائی، جس کا اثر یہ ہوا کہ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے بہت جلد عربی بول چال میں مہارت حاصل کر لی۔ مولانا اس کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''چند ہی دن بعد انہوں نے عربی میں بولنا لازم کر دیا۔ اُردو بولنے پر دو پیسے یا ایک آنہ کا جرمانہ ہوتا تھا، جو ہم لوگوں کو اکثر ادا کرنا پڑا۔'' (۳)

اسلامی ماحول اور تربیت کے ساتھ ساتھ تحریر وتقریر کا ذوق اور ترغیب بھی انہیں وراثت میں ملی ہوئی تھی لہٰذا بہت جلد علمی کتب تحریر کرنا شروع کر دیں۔ مولانا اپنی کتاب ''نبیٔ رحمت'' کے پیش لفظ میں اپنی اس کتاب کی تحریر مکمل ہونے پر اظہارِ تشکر کرتے ہوئے اس بہترین کاوش کو خاندانی تربیت کا ثمر قرار دیتے ہیں:

''اس میں سب سے بڑا حصہ اس (مصنف) کے برادر اکبر ڈاکٹر حکیم مولوی سید عبدالعلی صاحبؒ کی حکیمانہ تربیت اور راہنمائی کا ہے۔ اس کا فائدہ تھا کہ اس نے بہت کم سنی اور نوعمری میں اُردو کی وہ بہترین کتابیں پڑھ لیں جس میں عربی زبان کے بعد سیرت کا بہت بڑا ذخیرہ ہے اور عہد آخر میں اس پر بڑا کام ہوا ہے۔ جب عربی زبان و ادب کا کچھ ذوق پیدا ہوا تو اس نے اپنی ساری توجہ سیرت کے عربی مآخذ پر مرکوز کر دی۔'' (۴)

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی تحریروں کا جائزہ لینے کے بعد یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ان تحریروں میں وسعت اور بالغ نظری کے پیچھے ان کے خاندان کے تعلیم یافتہ افراد کی جدوجہد، عربی زبان میں اظہار خیال اور ندوۃ العلماء کی علمی اور انتظامی ذمہ داریوں کا بھرپور حصہ ہے جس سے ان کی تحریروں میں نکھار پیدا ہو گیا ہے۔ مولانا اپنے ذوق

تصنیف کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اس تصنیفی ذوق کا، جو کہ کم از کم تین پشتوں سے موروثی چلا آ رہا ہے تھا، خاندانی افتادِ طبیعت جو ہنگاموں اور سیاسی کاموں سے مناسبت نہیں رکھتی تھی، پھر عالم عربی کے حالات سے قلبی و ذہنی وابستگی اور اس کی وجہ سے عربی کو اظہارِ خیال کا ذریعہ بنانے، اس پر مستزاد دارالعلوم ندوۃ العلماء کی تعلیمی وتربیتی ذمہ داری..... نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔'' (۵)

ندوۃ العلماء میں عربی تدریس کی ذمہ داری:

ندوۃ العلماء لکھنوء نے مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی عربی زبان وادب پر دسترس کو پیش نظر رکھتے ہوئے انہیں تفسیر وادب مقرر کیا اور ان کے ذمہ تفسیر القرآن کی نامور عربی کتب لگائی گئیں۔ مولانا اپنی تدریسی ذمہ داریوں کا بیان ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''۱۹۳۴ء میں ہیچمدان کا تقرر دارالعلوم ندوۃ العلماء میں استاذ تفسیر وادب کی حیثیت سے ہوا اور انہی دونوں مضامین کے اسباق اس کے سپرد ہوئے۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تفسیر کی قدیم ومستند کتابیں (جلالین، بیضاوی اور کشاف) داخل نصاب تھیں۔'' (۶)

مولانا محمد اسجد قاسمی ندوی، مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی ادبی خدمات کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے مولانا کے ذمہ عربی ادب کی کتب کا بھی تذکرہ کرتے ہیں جن کی تدریس مولانا ابوالحسن علی ندوی کی عربی زبان وادب میں مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ چنانچہ مولانا اسجد قاسمی اُن کی عربی زبان وادب میں مہارت نامہ کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

۱۹۳۴ء میں جب مولانا ندوۃ العلماء کے استاذ منتخب ہوئے تو عربی ادب کی بعض کتابیں آپ سے متعلق رہیں جن میں دیوان حماسه، القرأة الرشيد، حكايات الاطفال وغیرہ شامل ہیں، اسوقت ندوہ کی پوری فضاء پر عربی زبان وادب، انشاء وخطابت چھائی ہوئی تھی۔ مشہور ادیب مولانا مسعود عالم ندوی کی رفاقت میں مولانا کی ادبی وعلمی سرگرمیاں تیز تر ہوتی گئیں، عربی زبان کی تعلیم میں خلیل عرب کی طرح گھول کر پلا دینے اور ہر طرح سے مشق کرانے کا اہتمام مولانا نے خوب خوب کیا۔ (۷)

عربی زبان سے صحیح معنوں میں شناسائی کے لیے قرآن کریم کے متن کو عربی تفاسیر کی روشنی میں پڑھنا ازحد ضروری ہے۔ اس سے نہ صرف دین اسلام کی تفہیم بہترین انداز میں ہوسکتی ہے بلکہ عربی زبان وادب سے بھی واقفیت حاصل ہوسکتی ہے۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی کی سرپرستی میں ندوۃ العلماء استاذ کے نصاب میں بات اس کا خصوصی اہتمام کیا گیا۔

''دارالعلوم ندوۃ العلماء کے نصاب تعلیم کی یہ خصوصیت ہے کہ اس نے برصغیر کے مدارس میں پہلی مرتبہ قرآن کریم کا نص (متن) (سلف کی تفسیروں کی روشنی میں) نصاب میں داخل کیا۔ قرآن کریم اور ادب عربی یہی دو بنیادی عناصر ہیں جن سے دعوت وتبلیغ کا ذہن تیار ہوسکتا ہے اور اس کی صلاحیت و قدرت پیدا ہوسکتی ہے اور جب تک کہ قرآن کریم سے شغف نہ ہو اور وہ ایک زندہ کتاب کی طرح نہ پڑھا جائے اور عربی زبان کا صحیح مذاق حاصل نہ ہو اس وقت تک دین کی صحیح فکر اس کے اولین ماخذ سے حاصل نہیں کی جاسکتی۔''(۸)

عربی زبان وادب کے فروغ میں جہاں کتب تفسیر کی تدریس کا خصوصی اہتمام کیا گیا تھا۔ وہاں مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی خصوصی توجہ سے طلبہ میں تحریر تقریر اور دعوت وتبلیغ وغیرہ کے اوصاف پیدا کرنے کے لیے بھی عربی زبان کو ذریعہ اظہار رائے بنایا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ندوۃ العلماء کو برصغیر پاک و ہند کی درس گاہوں میں ایک نمایاں مقام حاصل ہوا۔

''دارالعلوم ندوۃ العلماء نے عربی زبان کو ایک زندہ زبان کی طرح پڑھانے کا نظم کیا جو صرف کتابوں میں محدود نہیں ہے بلکہ وہ تقریر وتحریر، علم وادب، تبلیغ ودعوت اور سیاست وصحافت کی بھی زبان ہے۔ برصغیر کی درسگاہوں کے درمیان اللہ تعالیٰ نے ندوہ کو اس خصوصی توفیق سے نوازا جس کا محرک سوائے اس کے کچھ بھی نہیں کہ عربی زبان ودعوتِ دین کا اولین ذریعہ ہے۔''(۹)

اصلاح نصاب کی کوششیں:

مولانا کا تعلق چونکہ ندوۃ العلماء لکھنوء سے تھا لہٰذا وہ اس کی اصلاح وبہتری کے لیے ہر ممکن کوشاں رہتے۔ علاوہ ازیں مدرسہ میں پڑھائے جانے والے نصاب میں عربی زبان کی ضرورت اور اہمیت کو اُجاگر کرنے کی کوشش کرتے تاکہ ندوہ میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ اس کے ذریعے اپنے اندر بہترین تحریر وتقریر کی استعداد پیدا کرسکیں۔ ندوہ العلماء کے منتظمین کے اغراض مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا ابوالحسن علی ندویؒ بیان کرتے ہیں کہ یہاں عربی زبان کی تدریس کو خاص اہمیت دی جاتی ہے:

''ندوۃ العلماء'' کے بانیوں اور منتظمین نے ہمیشہ نصاب کو ''وسیلہ'' سمجھا غایت نہیں۔ غایت اور مقصد میں ترمیم نہیں ہوتی لیکن وسیلہ میں ترمیم ہوتی ہے۔ درس نظامی میں بھی برابر ترمیم ہوتی رہتی ہے۔ پھر بتایا گیا کہ اس وقت عربی زبان کی تدریس ایک زندہ عملی زبان کی حیثیت سے بہت ضروری ہے۔''(۱۰)

ندوۃ العلماء لکھنوء کے قیام کے بنیادی مقاصد میں ان امور کو خاص طور پر پیش نظر رکھا گیا کہ طلبہ درسی کتب کی درس و

تدریس کے ساتھ ساتھ عربی زبان میں تحریر وتقریر میں مہارت و ملکہ حاصل کریں اور ان کے ذریعے عرب ممالک میں بھی اپنا پیغام پہنچانے کی صلاحیت حاصل کریں۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ ایسے اقدامات اٹھانے پر ندوۃ العلماء کے بانیوں کی دوراندیشی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''پہلے عربی زبان کی کل قیمت اور اہمیت یہ سمجھی جاتی تھی کہ وہ قدیم درسی کتابوں کے سمجھنے کا ایک ذریعہ اور پل ہے، اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ایک بنیادی بات ہے اور اس کا اصل فائدہ اور مقصد ہے۔ لیکن ندوۃ العلماء کے قیام سے پہلے کسی کو یہ احساس نہیں تھا کہ دعوتی مقاصد کے لیے بھی عربی زبان کو حاصل کرنا چاہیے۔ اس کو ذریعہ بنا کر عربوں کو دعوت دی جاسکتی ہے اور انہیں ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا جاسکتا ہے۔ وہ عرب جن سے ہمیں ایمان جیسی لازوال دولت ملی۔''(۱۱)

اصلاح نصاب اور کتب ندوی:

ندوۃ العلماء کے نصاب کو جدید تقاضوں سے ہمکنار کرنے کا جذبہ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کے دل و دماغ میں موجزن تھا۔ اس خواب کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے انہوں نے نوجوانی میں ہی ایک عظیم الشان کتاب مرتب فرمائی۔ مولانا اسجد قاسمی ندوی اس کتاب کی اہمیت کے بارے میں رقمطراز ہیں:

''مولانا سید ابوالحسن ندویؒ کے دل میں نئے نصاب کی ترتیب کا داعیہ بڑی تیزی سے پیدا ہوا، اس کام کا آغاز ''مختارات من ادب العرب'' کی ترتیب سے ہوا جو قرن اول سے لے کر عصر حاضر تک کے عربی نثر وادب کے اعلیٰ نمونوں پر مشتمل ہونے کے ساتھ سجع وقافیہ اور تصنع اور تکلف سے آزاد اور صالح مقاصد اور صحت مند خیالات کی آئینہ دار بھی ثابت ہوئی۔ یہ کتاب ۱۹۴۰ء میں مکمل ہوئی اور ۱۹۴۲ء میں پہلی بار زیور طبع سے آراستہ ہوئی۔ یہ کتاب بے حد مقبول ہوئی اور دمشق یونیورسٹی کے کلیۃ الشریعہ میں عربی ادب کے نصاب میں داخل کی گئی۔''(۱۲)

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی مرتبہ عربی ادب ونثر کی اس شاہکار کتاب کو بہت کم عرصہ میں بے پناہ پذیرائی حاصل ہوئی اور ہر مکتبہ فکر کے لوگوں نے اسے دادِ تحسین پیش کیا۔ مختلف تدریسی اداروں نے اسے شاملِ نصاب کرنا اپنے لیے اعزاز سمجھا۔

''مختارات زیادہ تر جدید حلقوں اور یونیورسٹیوں کے ایم اے عربی کے کورس میں داخل ہوئی جن میں علی گڑھ، الہ آباد، حیدرآباد، مدراس، دہلی اور لکھنؤ کی یونیورسٹیاں نمایاں ہیں، سعودی عرب کی

وزارت تعلیم نے بھی اس کو اپنے یہاں کے نصاب میں داخل کیا، پاکستان و بنگلہ دیش، عرب ممالک اور بعض مغربی ممالک میں بھی یہ داخل درس ہوئی۔'' (۱۳)

عربی ادب کے شاہکار نمونوں پر مشتمل نادر کتاب ''**مختارات من ادب العرب**'' مولانا ندویؒ کی ایک بے مثال کوشش تھی۔ ایک ماہر نفسیات کی طرح انہوں نے اس کتاب میں مختلف انواع و اقسام کی تحریروں کو جمع کیا تا کہ طلباء میں دلچسپی کا سامان پیدا ہو سکے۔ مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی، اس کتاب کے مؤلف مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کو ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں:

''مؤلف نے سب سے پہلے مختارات کا مجموعہ تیار کیا، جو اسلامی عربی ادب کے نمونے اپنے تمام مظاہر اور پہلے اسلامی دور سے لے کر چودھویں صدی ہجری تک مختلف ادبی، تاریخی، اور تہذیبی شکلوں میں پیش کرتا ہے، اس میں عربی ادب کے مختلف رنگ و آہنگ بھی ہیں، آسمانی وحی اور نبوی بلاغت کے شاہکار بھی ہیں، عربی کے سب سے ترقی یافتہ دور کے مشاہیر عرب خطباء کے خطبات کے نمونے بھی ہیں، روایات، قصص اور رسائل بھی ہیں، کتابیں، مناقشے، محاورات، اسفار اور عام گھریلو باتیں بھی ہیں، متانت سنجیدگی، حکمت و دانائی بھی، اور مزاحیہ ادب کے نمونے اور تفریحی چیزیں بھی ہیں۔'' (۱۴)

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے عربی زبان و ادب کے شاہ پاروں میں سے انتخاب کر کے ایک دوسری کتاب ''**القراۃ الراشدۃ**'' بھی مرتب کی جو تین حصوں پر مشتمل تھی۔ اسے بھی خاص و عام میں بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ خود مولانا اس کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہیں:

''کتاب میں اس کا التزام ہے کہ حتیٰ الامکان کوئی سبق دینی موعظت سے خالی نہ ہو اور آخر میں اس کا کوئی اخلاقی و دینی نتیجہ نکلتا ہو یا کسی دینی تعلیم یا آداب کی طرف رہبری ہوتی ہو، لیکن اس طرح کہ طالب علم کو محسوس نہ ہو کہ کوئی چیز اوپر سے یا باہر سے لائی جاری ہے، یا اس کو کوئی خارجی انجکشن دیا جا رہا ہے۔'' (۱۵)

ڈاکٹر محمد اقبال حسین ندوی کتاب کی وجۂ تالیف فروغ عربی زبان و ادب کو قرار دیتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''عربی زبان جس کا سرچشمہ کتاب و سنت ہے اس کا نصاب دین کے بنیادی فکر سے عاری تھا۔ خاص طور پر زبان کی ابتدائی تعلیم جو فرد کی زندگی میں پتھر کی لکیر ثابت ہوتی ہے اور عربی زبان کی تعلیم جو مسلم معاشرہ میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے، اس کے نصاب تعلیم پر القراۃ الراشد

الجز الاول کے مقدمہ میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور انہوں نے تحریر کیا کہ جو نصاب تعلیم عام طور پر رائج ہے اس میں اسلامی ثقافت وتہذیب اور سلف صالحین کی کوئی مثال نہیں ملتی بلکہ غلط تصویر کشی ہے اور بچوں کے ذہن ودماغ کے ساتھ ایک مذاق ہے۔''(۱۶)

ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی اس کتاب کی اہمیت کو اُجاگر کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

''بچوں کے ادب میں ایک خلا تھا کیونکہ بچہ کی ادبی اور لغوی تربیت میں دین کا حصہ بہت کم تھا حالانکہ عربی زبان ہی دین کی زبان ہے۔لیکن وہ دینی تعلیمات سے الگ تھلگ تھی، اور دنیاوی معاملات اور تمدنی معلومات سے الگ رہ گئی تھی۔اس بدنما عیب اور معیوب نقص کو اس سلسلہ کے مؤلف نے ''القراۃ الراشدہ'' کا سلسلہ شروع کیا، اور اس کتاب کے تین حصوں میں اس سلسلہ کو مکمل کیا اور ہر حصہ اپنے لغوی اور ادبی میعار میں بچوں کی ادبی ترقی اور ان کی مذہبی ثقافت میں وسعت کو دیکھتے ہوئے پہلے سے فائق ہے۔''(۱۷)

جس کتاب نے عربی زبان و ادب میں بے پناہ مقبولیت حاصل کی وہ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی مرتبہ کتاب **قصص النبیین** ہے۔ یہ کتاب کامل کیلانی کی مرتبہ کتاب **حکایات الاطفال** کا بہترین نعم البدل ثابت ہوئی جس میں بہت سی فضول تصویریں اور لغو قصوں کی بھرمار تھی جس کی وجہ سے بچوں میں اخلاقی بگاڑ کا خدشہ پایا جاتا تھا۔لہٰذا مولانا نے بچوں کی اخلاقی تربیت کو پیشِ نظر رکھ کر انبیاء کرام کے حالات و واقعات پر مشتمل اس کتاب کی اشاعت کا بیڑا اُٹھایا۔''اس کتاب میں مولانا نے چند امور کا التزام کیا ہے۔

☆ ایک تو یہ کہ الفاظ کا ذخیرہ کم سے کم ہو،لیکن اعادہ وتکرار سے اسے ذہن میں نقش کر دیا جائے۔

☆ دوسرے یہ کہ کتاب قرآن کی زبان میں لکھی جائے اور آیاتِ قرآنی جگہ جگہ نگینہ کی طرح جڑ دی جائیں۔

☆ تیسری یہ کہ اسلام کے بنیادی عقائد (توحید، رسالت اور معاد) کی تلقین وتعلیم ضمناً ہو جائے۔

☆ چوتھے یہ کہ قصوں کو پھیلا کر لکھا جائے اور ان میں ایسی رہنمائی کا سامان ہو کہ بچوں کے دلوں میں کفر وشرک کی نفرت، ایمان وتوحید کی محبت اور انبیاء علیہم السلام کی عظمت راسخ ہو جائے اور یہ سب غیر شعوری طریقہ پر ہو۔''

''**قصص النبیین**'' نے بھی اہل علم کے ہاں خصوصی مقبولیت حاصل کی۔ برصغیر پاک و ہند کی بہت سی یونیورسٹیوں نے اسے ایم۔اے عربی کے نصاب میں شامل کیا ہے۔ پانچ حصوں پر مشتمل یہ کتاب طلبہ اور بچوں کے ادب میں بے مثال کتاب تصور کی جاتی ہے اور یہ کتاب مولانا کی مشہور کتاب السیرۃ النبویہ (نبی رحمت) تحریر کرنے کی محرک ثابت ہوئی۔''(۱۸)

مولانا محمد اسجد قاسمی ندوی اپنے مقالہ ''حضرت مولانا علی میاں کی ادبی خدمات اور تصانیف'' میں مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی ایک اور کتاب کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''قصص النبیین کے سلسلہ کے علاوہ مولانا کی ایک کتاب ''قصص من التاریخ الاسلامی'' بھی ادب الأطفال کے سلسلہ کی چیز ہے، ادب الأطفال (Children's Literature) کے علاوہ ادب نبوی کو واضح کرکے پیش کرنے میں مولانا کا اہم رول رہا ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت سی ان احادیث کو مولانا نے منتخب کرکے اپنی کتابوں میں جمع کردیا ہے جن میں صدق و اخلاص، جمال و بلاغت شرینی و چاشنی، ساتھ ہی پیغمبرانہ بلاغت و اعجاز کے عناصر پوری طرح ملتے ہیں، مولانا نے انتخاب میں صحت سند کا بڑا اہتمام کیا ہے، یہ احادیث ادب عربی کا سب سے کامیاب نمونہ ہیں۔''(۱۹)

مدارس اسلامیہ میں نصاب کی اصلاح ہمیشہ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کے پیش نظر رہی۔قبل ازیں عربی ادب مدارس اسلامیہ میں مروج نہ تھا مگر مولانا کی دور بین نگاہوں نے محسوس کرلیا کہ عربی ادب طلباء کی ذہنی نشوونما کے لیے ازحد ضروری ہے۔ عارف جنید، مولاناؒ کی اس معاملہ فہمی کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

مولاناؒ ندوہ میں ادب وتفسیر کے استاذ ہوئے، اور آپ نے اپنی فراست اور گہرے مطالعہ سے جلدی ہی اندازہ لگالیا کہ طلبہ کی ذہنی تعمیر اور فکری اصلاح میں ادب طاقتور وسیلہ بن گیا ہے، پس پھر کیا تھا، آپ نے اپنے رفقاء کی مدد سے ادب عربی کا بالکل نیا نصاب تیار کرڈالا، جس میں بقول مولانا مسعود عالم ندوی ''زبان اور دین کو اس طرح ایک دوسرے سے پیوست کردیا ہے جیسے گوشت اور ناخن۔

قصص النبیین، القرأة الراشدہ اور **مختارات** آپ کی وہ درسی کتابیں ہیں، جو تقریباً ہندوستان کے ہر دینی مدرسہ میں داخل نصاب ہیں، اور عصری درسگاہوں میں بھی ان کو خاصی اہمیت حاصل ہے، مولانا کی دوسری عربی تصنیفات بھی اہم دینی مدارس میں طلبہ کے مطالعہ کے لئے تجویز کی جاتی ہیں۔''(۲۰)

مولانا ابوالحسن علی ندوی کی تصنیف کردہ کتب میں ان کے اسلوب نگارش کا تذکرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر اقبال حسین ندوی لکھتے ہیں:

مولانا نے ہندوستان کے مدارس میں تعلیم پانے والے طلبہ کو مدنظر رکھ کر بچوں کے لیے کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ہندوستان کے طلبہ عربی زبان عام طور پر نو دس سال کی عمر میں پڑھنا شروع کرتے ہیں جو بچپن اور مراہق کے درمیان کی عمر ہوتی ہے۔مولانا نے عمر کے لحاظ سے نفسیات کا پورا خیال رکھا ہے

اور بچوں کی ذہنی استعداد کی رعایت کرتے ہوئے مضامین، مواد اور طرز کو اپنایا ہے۔(۲۱)

چونکہ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی تعلیم وتربیت میں عرب اساتذہ اور خاندانی مذہبی اور علمی رجحان نے سونے پہ سہاگہ کا کام کیا تھا لہٰذا آپ کی تحریر میں وہ جاذبیت اور اثر آفرینی پائی جاتی تھی جو ان کے معاصرین کے ہاں بہت کم پائی جاتی ہے۔ قاری اس کی تحریر کے سحر میں مبتلا ہوجاتا اور تادیر مطالعہ میں مصروف رہتا ہے، یہی وجہ ہے کہ آپ نے جلد ہی شہرت چہار دانگ عالم حاصل کرلی۔

''مولانا کی عربی وادبی عبارتوں میں بے پناہ جاذبیت اور سحر ہے۔ یہ امتیاز انھیں بلند پایہ افراد کو میسر آتا ہے جو بات کی تہہ اور حقیقت تک پہنچ جائیں۔ یہ قرآن کے شغف و برکت کا نتیجہ ہے۔ مولانا کی کوئی تقریر قرآن وسنت کے حوالوں سے خالی نہیں ہے بلکہ اس میں ایسی حلاوت وتاثیر ہوتی ہے جو معاصرین کے یہاں ناپید ہے۔ ساری تالیفات میں یہی جوش وجذبہ کارفرما ہے کہ اسی لئے پڑھنے والا مولانا کے پاکیزہ احساسات، دل کی دردمندی، عقل کی بلندی اور فکر کی سلامتی کا گرویدہ ہوتا چلا جاتا ہے۔''(۲۲)

فروغ عربی زبان وادب میں مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کا کردار ناقابل فراموش ہے۔ اُن کے پیش نظر طلباء اور نوجوان نسل کی دراصل صراط مستقیم کی طرف راہنمائی تھی۔ عربی زبان وادب پر مہارت کی وجہ سے اس مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے قصص الانبیاء کو ایک اچھوتے انداز میں پیش کیا۔ ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی مولانا ابوالحسن علی ندوی کے اسلوب تحریر کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''آپ نے عربی زبان کے اپنے ممتاز ومخصوص اسلوب کے ذریعہ بچوں کے ادب کو مالا مال کیا، اور مسلمان نسل کو قرآن کریم کی روشنی اور مستند اسلامی تاریخ کے آئینہ میں انبیاء کرام کے قصوں اور رسولوں کی حکایت سے صحت بخش غذا بہم پہنچائی۔ آپ نے آسان اور خوبصورت عربی زبان اور پختہ ادبی اسلوب میں انبیاء کرام کے قصوں اور ان کی حکایات کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ جس میں بچوں کی ابتدائی، درمیانی اور اخیر زندگی کے مختلف مراحل میں ان کی ذہنی سطح اور ان کے تقاضوں اور ضروریات کی مکمل رعایت کی۔''(۲۳)

عربی زبان وادب میں مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی مہارت قابل رشک تھی۔ برصغیر پاک وہند میں نہ صرف اپنی مثال آپ سمجھے جاتے تھے بلکہ عرب ممالک میں بھی آپ قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے۔ اکثر اوقات عرب ممالک میں آپ کو مدعو کیا جاتا اور آپ کے افکار سے استفادہ کیا جاتا۔

''اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا کو پوری امت مسلمہ اور عالم انسانیت کے لئے ایک فکرمند دل دے کر پیدا کیا تھا اور زبان بھی ایسی فصیح و بلیغ عطا فرمائی تھی کہ سامع اور قاری ان کی فصاحت و لطافت میں کھو جاتے تھے۔عربی زبان و بیان پر ان کی قدرت ومہارت کا یہ عالم تھا کہ اہل عرب بھی اس پر رشک کرتے تھے، حالانکہ اہل زبان بہت کم کسی غیر زبان کی زبان دانی کا اعتراف کرتے ہیں۔ لیکن حضرت مولانا اس عہد کے غالبًا واحد عجمی تھے جن کے زبان دانی کو عرب بھی رشک بھری نظروں سے دیکھتے اور سحر زدہ ہوکر سنتے تھے۔''(۲۴)

عربی زبان و ادب میں ایک نمایاں مقام پر فائز ہونے کے باوجود ان میں غرور اور تکبر نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ دوران درس و تدریس طلباء کو بڑی جانفشانی سے عربی ادب کی نکتہ آفرینیوں سے آگاہ فرماتے۔ بلکہ اکثر اوقات کوئی نقطہ یا تعبیر بیان کرتے وقت کبھی یہ بتاتے ہوئے عار محسوس نہ کرتے کہ یہ بات انہوں نے کس شخص یا کتاب سے حاصل کی ہے۔

''ادب عربی میں اپنا خاص مقام رکھنے اور فن کی باریکیوں میں مہارت کے باوجود ایک دفعہ مولانا نے بلاتردد طلبہ کے سامنے بیان کردیا کہ کسی بات پر زور دینے کے لئے عربی میں کیا تعبیر اختیار کی جاتی ہے، اس کو انھوں نے ایک عربی عالم کے زبان سے ایک کانفرنس کی ذیلی کمیٹی کے دوران اخذ کیا، اور پھر آپ نے پورا قصہ سنایا، الارکان الاربعة کے درس کے دوران جب کوئی نادر تعبیر آتی تو آپ اس کی خوبیوں کو مزے لے لے کر بیان کرتے اور فرماتے کہ آپ نے یہ تعبیر کہاں سے لی ہے۔''(۲۵)

مدارس عربیہ کی اصلاح اور مولانا ندویؒ:

یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ عربی زبان ایک فصیح و بلیغ زبان ہے جس میں درس و تدریس کے علاوہ ہر طرح سے علمی و ادبی گفتگو کرنے کی اہلیت موجود ہے۔ برصغیر پاک و ہند کے دینی و تبلیغی اداروں اور اہل علم حضرات کو عربی زبان و ادب کے فروغ میں اپنا بھرپور کردار ادا کرنا چاہیے کیونکہ دنیا کے دیگر ممالک کے علاوہ عرب ممالک میں اپنے فکری پیغام کی نشر و اشاعت کے لیے عربی زبان مدد و معاون ثابت ہوسکتی ہے۔مولانا ابوالحسن علی ندویؒ مدارس عربیہ کے منتظمین اور مبلغین اسلام کے لیے اس کی اہمیت کو اُجاگر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہمارے مدارس میں جس انداز پر عربی زبان و ادب کی تعلیم ہو رہی ہے اس کے ساتھ ان ملکوں میں کوئی علمی خدمت یا دعوتی کام ناممکن ہے، اگر آپ کو عرب دُنیا میں دین کی دعوت و تبلیغ کا کام انجام دینا ہے یا ہندوستان کی دینی و علمی تحریکات کا تعارف کرانا ہے تو اس کے لیے بڑے پیمانے پر

تیاری کی ضرورت ہوگی۔ اب ہندوستان ان ملکوں سے الگ نہیں رہ سکتا، دُنیا کی سیاست میں شرق اوسط کو خاص اہمیت حاصل ہے اور یہ اہمیت بڑھتی جائے گی۔'' (۲۶)

علماء وفضلاء کا یہ دینی اور اخلاقی فریضہ ہے کہ نوجوان نسل کی درست سمت کی طرف راہنمائی کریں اور انہیں اہل عرب اور عربی زبان کی عظمت سے روشناس کرایا جائے تاکہ وہ اپنی صلاحیتوں کو اُبھار کر سامنے لاسکیں اور ملک وملت کا نام روشن کریں۔ مگر مولانا ابوالحسن ندویؒ کے خیال میں علماء اپنے اس فریضہ سے غافل نظر آتے ہیں۔ اساتذہ اور اہل قلم کو اپنے اس فریضہ کی ادائیگی کی طرف متوجہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

ایک طرف اس کی ضرورت تھی کہ عربی ادب کے خزانۂ عامرہ سے وہ طاقت ور اور دل آویز ادبی وتحریری نمونے نکالے جائیں اور ان کو نمایاں کیا جائے، جن کو سہولت پسندی اور قدیم مؤرخین ادب کی پیروی میں نظر انداز کر دیا گیا۔ یا اس قصور میں کہ وہ کسی عالم وداعی اور دینی شخصیت کے قلم سے نکلے ہیں، ان کو ''ایوان ادب'' سے دور کر دینے یا الگ رکھنے کی سزا دی گئی، اور صدیوں ان پر پردہ پڑا رہا۔ دوسری ضرورت اس کی تھی کہ ادب عربی کے ایسے اساتذہ، اہلِ قلم اور دانشوروں کو جمع کیا جائے جو عربی ادب و انشاء اور تنقید وتاریخ ادب کو صحیح رُخ پر لگانے کی کوشش کریں، اور جدید نسل کو صالح غذا پہنچانے کے لیے ایک نیا ذخیرہ کتب (مکتبہ) اور ایک نیا مدرسۂ فکر (مکتبہ خیال) پیدا کرسکیں۔ (۲۷)

ایک مسلمان کا اپنے آقا ومولیٰ محمد مصطفیٰ ﷺ کے ساتھ ایک قلبی وروحانی تعلق، اس مسلمان کے ایمان کی مضبوطی کی علامت ہے۔ نبی محترم ﷺ کے سرچشمۂ فیضان سے سیراب ہوکر ایمان مزید مستحکم ہوتا ہے۔ مدارس عربیہ جہاں عربی زبان فہمی اور قرآن وسنت کی تعلیم کا انتظام ہوتا ہے، وہ بھی اس سرچشمہ سے فیضیاب ہوتے ہیں۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ مدرسہ کی اہمیت کا احساس دلاتے ہوئے واضح کرتے ہیں:

''میں مدرسہ کو ہر مرکز سے بڑھ کر مستحکم، طاقت ور، زندگی کی صلاحیت رکھنے والا اور حرکت ونمو سے لبریز سمجھتا ہوں۔ اس کا اک سرا نبوت محمدیؐ سے ملا ہوا ہے، دوسرا سِرا اس زندگی سے۔ وہ نبوت محمدیؐ کے چشمۂ حیوان سے پانی لیتا ہے اور زندگی کے کشت زاروں میں ڈالتا ہے، وہ اپنا کام چھوڑ دے تو زندگی کے کھیت سوکھ جائیں اور انسانیت مرجھانے لگے۔ نہ نبوتِ محمدی ﷺ کا دریا پایاب ہونے والا ہے۔ نہ انسانیت کی پیاس بجھنے والی ہے، نہ نبوت محمدی کے چشمۂ فیض سے بُخل وانکار ہے، نہ انسانیت کے کاسۂ گدائی کی طرف سے استغناء کا اظہار، ادھر سے انما انا قاسم و اللہ یعطی کی صدائے مکرر ہے، تو ادھر سے ھل من مزید، ھل من مزید کی فغان مسلسل، مدرسہ سے بڑھ

کر دُنیا میں کون سا زندہ، متحرک اور مصروف ادارہ ہوسکتا ہے۔'' (۲۸)

یقیناً مدارسِ عربیہ، عربی زبان کی اشاعت و ترویج میں بھرپور کردار ادا کر رہے ہیں جن میں ندوۃ العلماء لکھنؤ کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ یہ ایسے ادارے ہیں جہاں قرآن و حدیث اور دیگر علوم کی تدریس کا اہتمام عربی زبان میں ہوتا ہے۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ مدرسہ میں صرف عربی زبان کی درس و تدریس ہی نہیں ہونی چاہیے بلکہ ندوۃ کی تقلید میں طلبہ کی کردار سازی کی طرف بھی توجہ ہونی چاہیے اور طلبہ کی اس طرح تعلیم و تربیت کا بندوبست ہو کہ ان کا اپنے خالق کے ساتھ تعلق مضبوط ہونا چاہیے:

''میں کسی بھی مدرسہ کی یہ تعریف ماننے کے لیے ہرگز تیار نہیں کہ جہاں ایسی زبان سکھائی جاتی ہے جس کی بدولت عربی کتابیں پڑھی جاسکیں اور اس سے دُنیاوی فائدے اُٹھائے جاسکیں۔ عربی مدرسہ کی ہرگز یہ تعریف نہیں، بلکہ وہ تو وہ جگہ ہے جہاں طالب علم کے درمیان، جیسا کہ میں نے پہلے کہا، اور خدا کے درمیان ایک بلاواسطہ کڑی ہے، جس کا ایک سرا ادھر ہے اور دوسرا اللہ کے قبضہ میں ہے۔'' (۲۹)

مولانا ندویؒ کی تحریروں میں یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ برصغیر پاک و ہند کے تعلیمی اداروں اور یونیورسٹیوں میں عربی زبان اور اسلامیات کے ساتھ ہونے والے ناروا سلوک پر مولانا ابوالحسن علی ندویؒ متفکر رہتے تھے اور اربابِ علم و دانش کو اس المیہ پر نہ صرف توجہ دلاتے، بلکہ اس کے تدارک کے لیے عملی اقدامات اُٹھانے کی بھی ترغیب دیتے۔ تاکہ ارباب اختیار اس تلخ حقیقت سے آگاہ ہوں اور پھر عربی زبان کی تدریس و اشاعت پر بھی مائل ہوں اور اس کے ذریعے طلبہ کو دین اسلام کی تفہیم اور عربی زبان و ادب کی درس و تدریس کا اہتمام ہوسکے:

''سیاسیات و معاشیات اور تاریخ و ادب سے الحاد و تشکیک کا کام لیا جا رہا ہے، علومِ عمرانیہ (سوشیالوجی) اور انگریزی ادب کے ذریعہ مذہب بیزاری اور ذہنی انتشار پیدا کیا جاتا ہے۔ آپ کے لیے شاید ایک حیرت انگیز انکشاف ہوگا کہ آج بہت سی یونیورسٹیوں کے عربی و اُردو کے شعبے الحاد و تشکیک کے مرکز بنے ہوئے ہیں اور شاید بعض یونیورسٹیوں میں عربی، مطالعہ اسلامیات دینی حیثیت سے سب سے کمزور ہے۔ ہم کو اس صورتِ حال کا وسیع النظری، وسیع القلبی اور حقیقت پسندی کے ساتھ جائزہ لینا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ ہم کو زندگی کے میدان میں اُترنے اور اسلامی دعوت اور شریعت اسلامی کی حفاظت کا مقدس فریضہ اپنے ذمہ لینے سے پہلے کیا تیاریاں کرنی چاہیے اور کن جدید اسلحہ سے مسلح اور کن جدید طریقہ ہائے جنگ سے واقف اور ماہر ہونا چاہیے۔'' (۳۰)

عربی زبان وادب کی اہمیت اور مولانا ندویؒ:

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے عربی زبان وادب کے فروغ کے لیے بھرپور جدوجہد کی۔ اپنی تحریر وتقریر میں طلبہ اور اہل علم حضرات کو عربی زبان کی ضرورت واہمیت کا احساس دلاتے رہے۔ عربی کے اساتذہ اور علماء کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھتے۔ ان کی تحریروں میں اکثر اس کا بھرپور اظہار نظر آتا ہے۔ برصغیر پاک وہند میں عربی زبان وادب میں مہارت رکھنے والوں کی فضیلت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہر دور میں یہاں عربی زبان سے دلچسپی رکھنے، اس کے سمجھنے اور اس میں تحقیقی تصنیف کرنے والے موجود رہے۔ یہ قرآن کا معجزہ ہے کہ یہاں کے فضلاء اس ملک میں رہتے ہوئے عربی زبان پر عبور اور پوری طرح دسترس رکھتے ہیں۔''(۳۱)

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کو یہ اعزاز حاصل تھا کہ آپ عالمی رابطہ ادب اسلامی کے صدر تھے۔ ان کی کوششوں سے ندوۃ العلماء لکھنؤ میں اس کی ایک شاخ قائم کی گئی۔ جہاں فروغِ عربی زبان وادب کی بھرپور کوششیں ہوتی رہیں۔

''رابطۂ ادب اسلامی کے پلیٹ فارم ادب اسلامی کا پیغام عام کرنے کے لیے سیمیناروں کے علاوہ متعدد کتابیں، اردو عربی رسائل بھی شائع ہوتے رہے ہیں۔ جن میں حضرت مولانا کی کتاب ''نظرات فی الادب'' اور متعدد چھوٹے رسائل سرفہرست ہیں۔ عربی اردو کے دو مجلّات (الأدب الاسلامی، کاروان ادب) ندوۃ العلماء سے بھی شائع ہوتے ہیں۔''(۳۲)

عربی زبان کو جو مقام ومرتبہ حاصل ہے کسی اور زبان کے حصہ میں نہیں آیا۔ ابتداءِ اسلام سے لے کر آج تک اس کی اہمیت برقرار ہے اور ابد تک جاری رہے گی۔ مولانا ندویؒ نے عربی زبان کی فضیلت واضح کرتے ہوئے اسے سیکھنے اور اس میں عبور حاصل کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے عربی زبان کی عظمت یوں واضح فرمائی:

''یہ قرآن، نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرامؓ اور داعیان اسلامؒ کی زبان ہے، جنہوں نے اس زبان کے ذریعہ پوری دُنیا میں دین کو پھیلایا اور بے شمار زحمتیں اُٹھائیں، جس کے باعث دونوں جہاں میں سرخرو ہوئے۔ ..... اُردو، فارسی اور دیگر زبانیں حالات کے لحاظ سے عروج وزوال کا شکار ہوسکتی ہیں، کوئی زبان رہے یا نہ رہے عربی زبان قیامت تک باقی رہے گی۔ خود اس ملک میں بھی جب تک مسلمان اور اسلام ہے عربی زبان زندہ رہے گی۔''(۳۳)

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ برصغیر پاک وہند کے عظیم لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے بھی فروغ زبان عربی کے لیے ترغیب دی اور لوگوں کو احساس دلایا کہ دین فہمی اور قربِ رسولؐ حاصل کرنے کے لیے بہترین

ذریعہ عربی زبان کا فہم لازم وملزوم ہے۔ یہ زبان ہمارے آباؤ اجداد کی زبان ہے اور ہجرت کے بعد ہم اپنی اصل زبان کو فراموش کر چکے ہیں۔ سید ابو الحسن علی ندویؒ بھی ان کے ایک رسالہ "المقالة الوضية فی النصيحة و الوصيحة" کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں کہ اُنہوں نے اس رسالہ میں تحریر فرمایا ہے کہ عربی زبان کی نسبت رسول اللہ ﷺ سے ہونے کی وجہ سے اس کی درس وتدریس دارین میں سعادت مندی کا باعث ہے اور خوش قسمت ہیں وہ لوگ جنہیں اللہ تعالیٰ نے اس مقصد کے لیے منتخب فرمایا ہے:

''ہم پردیسی لوگ ہیں، ہمارے آباء واجداد نے ہندوستان کی طرف ہجرت کی۔ نسب اور زبان کی عربیت ہمارے لیے سرمایۂ فخر ہے کہ یہی ہمارے لیے سیدُ الاولین و الاخرین، افضل الانبیاء و المرسلین، مفخر وجود صلی اللہ علیہ وسلم سے قرب کا ذریعہ ہے.....ہم میں سے خوش نصیب وہ ہے جس کو عربی زبان، اس کی صرف ونحو اور کتب ادب سے حصہ ملا ہو، اور اس کو حدیث وقرآن سے واقفیت ہو، ہمارے لیے حرمین شریفین کی حاضری اور ان کے ساتھ تعلق خاطر بھی ضروری ہے، یہی ہماری سعادت کا راز ہے اور وہ کم نصیب اور محروم ہے جو اس سے روگردانی کرتا ہے۔''(۳۴)

مولانا ابو الحسن علی ندویؒ عربی زبان وادب کی اہمیت سے آگاہ تھے۔ انہیں اس بات کا بھرپور ادراک تھا کہ عربی زبان نہ صرف دینی علوم کے حصول کا ذریعہ ہے بلکہ جدید عصری علوم میں بھی مہارت حاصل کرنے کا باعث ہوسکتی ہے لہٰذا مسلمانان برصغیر پاک و ہند کو عربی زبان سیکھنے کی بھرپور جدوجہد کرنا چاہیے تاکہ دینی وعصری علوم میں مہارت حاصل کی جاسکے۔ طلبہ کو اس کی اہمیت کا احساس دلاتے ہوئے مولانا ابو الحسن علی ندویؒ لکھتے ہیں:

''عربی زبان اس وقت ایک زندہ اور طاقت ور زبان ہے، عرب ملکوں میں وہ اپنے عروج اور شباب پر ہے۔ وہ تصنیف وتالیف، خطابت وتقریر، سیاست وصحافت، علم وفلسفہ اور دستور وقانون کی زبان ہے اور وہ پورے طور پر نکھر گئی ہے۔''(۳۵)

برصغیر پاک و ہند میں عمومی طور پر یہ تصور کیا جاتا ہے کہ عربی زبان سیکھنے کا مقصد صرف ترجمہ کی صلاحیت حاصل کرنا ہے جبکہ مولانا ابو الحسن علی ندویؒ طلبہ کو ترغیب دیتے ہیں کہ عربی زبان وادب کے حصول میں محنت اور لگن کے ذریعے اپنا لوہا منوایا جائے اور عربی زبان بھرپور میں مہارت کے ذریعے ایسی کارکردگی کا مظاہرہ کیا جائے جو دیگر افراد کے لیے قابل تقلید نمونہ بن سکے۔

''ہر جگہ اس علم کی قدر ہے بشرطیکہ آپ نے اس میں کوئی کمال حاصل کیا ہو۔ لیکن کمال کس کو کہتے ہیں، کمال شُد بُد کو نہیں کہتے، کمال ''کان یکون'' کو نہیں کہتے۔ کمال اس کو نہیں کہتے کہ آپ عربی

عبارت پڑھ لیں اور اس کو سمجھ لیں، اس کا نام کسی نے بھی کمال نہیں رکھا۔ کمال وہ ہے جسے کہتے ہیں کہ ''جادو وہ جو سر چڑھ بولے''، کمال وہ ہے جو اپنا اعتراف کرا لے۔''(۳۶)

عرب وعجم میں رابطہ بذریعہ عربی زبان:

قدیم زمانے سے عرب مبلغین دنیا کے کونے کونے میں اشاعتِ اسلام کے لیے سفر کرتے رہتے تھے۔ برصغیر پاک و ہند کے باشندوں کے دلوں میں ایمان وعمل کی روشنی انہی عرب مبلغین کی بدولت نصیب ہوئی۔ ان ہی کے دم قدم سے برصغیر پاک و ہند میں آج ہر طرف اسلام کا جھنڈا لہرا رہا ہے اور قرآن و حدیث کے ساتھ ساتھ علمائے متقدمین کی عظیم الشان کتب کا ذخیرہ بھی عربی زبان میں دستیاب ہے۔ ان بنیادی کتب کی تفہیم کے لیے عربی زبان کی تعلیم اشد ضروری ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ عصر حاضر کے عرب باشندے اسلام کا پیغام بھلا چکے ہیں اور انہیں اب تبلیغ اسلام کی ازسرِ نو ضرورت ہے۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ ان علماء متقدمین کی مساعیٔ جمیلہ کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''بلاشبہ اگر وہ مبلغین نہ ہوتے، ان کا جہاد نہ ہوتا، ان کی سچائی اور دیانت داری نہ ہوتی، ان کی بلند ہمتی اور اولوالعزمی نہ ہوتی تو اس علاقہ میں یہ دین نہ پھیلتا جس کے نام پر ہم ملتے ہیں۔ نہ یہ اسلامی اخوت ہوتی جس کی برکتوں سے بہرہ اندوز ہو رہے ہیں۔ نہ یہ قرآنی عربی زبان ہوتی جو عرب وعجم میں افہام وتفہیم اور تبادلۂ خیال کا وسیلہ ہے اور جس کو وہ اپنی نسلی زبانوں پر فوقیت دیتے ہیں۔''(۳۷)

عرب اقوام اور قبائل کے مختلف لہجوں کے باوجود ان سب کا ایک عربی زبان پر اتفاق اُمت مسلمہ کے لیے نہایت ہی خوش آئند بات ہے۔ برصغیر پاک و ہند کے لوگوں کو بھی اپنی مختلف زبانوں اور لہجوں کی وجہ سے کسی ایک زبان پر متفق ہونا محال ہے لہٰذا ایک عربی زبان کو قومی اور بین الاقوامی رابطہ کی زبان کے طور پر اپنانا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ برصغیر کی زبانوں اور عربی زبان کا تقابل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہندوستان کے تحتی براعظم میں زبانوں کی تعداد پندرہ ہے، اس میں بعض مستقل زبانیں بھی ہیں جن کے بولنے والوں کو ترجمان کی ضرورت پڑتی ہے یا انگریزی سے کام لینا پڑتا ہے۔ لیکن جزیرۃ العرب کا اپنی وسعت اور قبائل کی کثرت کے باوجود شروع سے طرۂ امتیاز رہا ہے کہ ظہورِ اسلام سے اس وقت تک اس کی ایک ہی مشترک زبان عربی ہے۔''(۳۸)

سید ابوالحسن علی ندویؒ کی دور بین نگاہ ان آثار واحوال کا مطالعہ کر رہی تھی جو مسلمانوں کے زوال اور ابتری کا باعث بن رہے تھے جن میں سے اپنی زبان وثقافت سے دوری بھی شامل تھے۔ لہٰذا انہوں نے اپنے دل کی آواز

درد مند دلوں تک پہنچانے کے لیے ایک کتاب تحریر کرنے کا ارادہ کیا جس میں عربی زبان کی اہمیت کو اُجاگر کیا جاسکے۔خصوصاً اہل عرب کے لیے جو اس وقت دیگر یورپی زبانوں سے مرعوب ہوکر عربی زبان سے روگردانی کر رہے تھے۔ایسے افراد کومسلمانوں اورعربوں کے عظیم الشان ماضی کی یاد دلاکر عربی زبان وادب کی طرف راغب کیا جاسکے تاکہ اس کی پیروی کرتے ہوئے ایک عظیم مستقبل کا حصول ممکن ہوسکے۔مولانا ابوالحسن علی ندویؒ اُس کتاب کی تحریر کا باعث بننے والے محرکات کے بارے میں اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جس ملک و ماحول سے مصنف کا تعلق تھا اور جہاں اس کتاب کی تصنیف کا خیال پیدا ہوا تھا، اس کا اقتضا تھا کہ یہ کتاب اس ملک کی زبان (اُردو) میں تصنیف کی جائے لیکن ایک خیال کے ماتحت اس کتاب کی تصنیف کے لیے اُردو کے مقابلہ میں عربی کو ترجیح دی گئی۔عربی زبان کی ترجیح و انتخاب کا محرک و باعث یہ احساس تھا کہ عرب ممالک اس احساس کمتری اور مرض خودفراموشی کا سب سے زیادہ شکار ہیں، دُنیا نے اگرچہ انہیں سے نئی زندگی اور ایمان پایا ہے، لیکن آج انہیں کی فضا سب سے زیادہ خاموش اور انہیں کا سمندر سب سے زیادہ پرسکون ہے.....عرب اپنی تاریخ اور اپنے جغرافیہ کے اعتبار سے اس کے اہل ہیں کہ بین الاقوامی سیادت سنبھالیں اور پوری متمدن دُنیا پر اثر ڈالیں۔ان کے ممالک بحراحمر اور بحرمتوسّط کے کنارے واقع ہیں۔وہ مغرب اور مشرق بعید کے درمیان میں ہیں۔نئے عالمگیر انقلاب اور اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے لیے عرب ممالک اور مشرق اوسط سے زیادہ موزوں سرزمین کوئی اور نہیں ہوسکتی۔یہ سب اسباب ومحرکات تھے جن کی بنا پر ہندی نژاد مصنف نے عربی زبان کو اس اہم موضوع کے لیے انتخاب کیا۔اور یہ کتاب سب سے پہلے عربی میں لکھی گئی جس کا نام ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' تھا۔''(۳۹)

طلبہ کی سہولت کی خاطر مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے اپنی متعدد کتب کے تراجم خود کیے تاکہ طلبہ ان کی مدد سے اصل عربی کتب کو سمجھنے میں سہولت محسوس کریں اور عربی سیکھنے میں دلچسپی بھی لیں۔

''تصنیف کے علاوہ مولانا کو ترجمہ پر بھی بے مثال قدرت حاصل تھی۔ماذاخسر العالم، القادیانی و القادیانیہ وغیرہ کا اردو ترجمہ بھی مولانا نے خود ہی کیا ہے۔اس کے علاوہ شاہ اسماعیل شہید کے رسالۂ توحید کو مولانا نے عربی میں منتقل کیا۔علامہ اقبال کے متعدد قصائد کا بھی عربی میں ترجمہ فرمایا۔اس کے علاوہ ترجمہ کے سلسلہ میں مولانا کے اور بھی قابل قدر کام ہیں۔''(۴۰)

فلاح امت کے اس احساسِ مروت کے پس منظر میں مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کے دل میں وہ اخوت و بھائی

چارہ تھا جس کی بنیاد نبی محترم ﷺ نے مواخاتِ مدینہ کے موقع پر رکھی اور تمام مسلمانوں کو آپس میں بھائی بھائی قرار دے دیا، خواہ ان کا تعلق کسی رنگ ونسل یا علاقہ سے ہو۔ علاوہ ازیں آپ نے تمام مسلمانوں کو ایک جسم کی مانند قرار دیا کہ اگر جسم کے کسی عضو میں تکلیف ہو تو پورا جسم اس تکلیف کو محسوس کرتا ہے۔ اہل عرب کو اس جسم میں دل کی حیثیت حاصل ہے اور اس دل کی دھڑکن نبی محترمؐ ہیں۔ لہٰذا عرب اور عربی زبان سے تعلق قائم رکھنا ایمان کی مضبوطی کی علامت اور رسول اللہؐ کے ساتھ محبت کا اظہار ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

''مسلمان عالم عربی کو اس حیثیت سے دیکھتا ہے کہ وہ اسلام کا گہوارہ ہے، انسانیت کی پناہ گاہ ہے، عالمی قیادت کا مرکز ہے، روشنی کا مینار ہے، اس کا عقیدہ ہے کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم عالم عربی کی جان، اس کے عزت وافتخار کا عنوان، اس کا سنگ بنیاد ہیں۔ اگر اس سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جدا کر دیا جائے تو اپنے تمام قوت کے زخیروں اور دولت کے چشموں کے باوجود اس کی حیثیت ایک بے جان لاشہ اور ایک نقش بے رنگ سے زیادہ نہ ہوگی۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ذات ہے جن کی وجہ سے عالمِ عربی عالمِ وجود میں آیا۔''(۴۱)

اسلامی اخوت و بھائی چارے کے فروغ اور عربی وعجمی کے فرق کو کم کرتے ہوئے مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی بھرپور جدوجہد سے ندوۃ العلماء لکھنوء نے **کلیۃ اللغۃ العربیہ** کا آغاز ۱۹۹۶ء میں کیا جہاں عربی زبان وادب کی تدریس کا خصوصی اہتمام تھا۔ جس میں متعدد مرتبہ عرب ممالک کی نامور شخصیات کو مختلف تقریبات میں شرکت کے لیے مدعو کیا جاتا۔ اس کلیۃ اللغۃ العربیہ کی افتتاحی تقریب میں آنے والے مہمانوں میں سے عالمِ عرب کے ممتاز خطیب ومعلم علامہ یوسف القرضاوی نے اپنے خطاب میں ندوۃ العلماء کے زیر انتظام اس عظیم الشان ادارہ کی فروغ عربی زبان وادب کے لیے کی جانے والی کوششوں کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے فرمایا:

''انتہائی مسرت کی بات ہے کہ ایک عجمی ملک میں (وہ بھی ہندوستان کی سرزمین پر) عربی زبان و ادب کی تعلیم کے لیے ایک پورا ادارہ موجود ہے۔ صحابہ کرامؓ جب کسی ملک کو فتح کرتے تو اسلام، عربی زبان اور اسلامی تہذیب پھیلاتے تھے۔ چنانچہ اسلام کی بدولت تمام ملکوں کی زبان عربی ہو گئی۔ مصری اپنی قبطی زبان بھول گئے، وہاں کی عیسائی آبادی بھی عربی بولتی ہے۔ عربی زبان کی خدمت کرنے والے بھی زیادہ تر عجمی تھے۔''(۴۲)

فتنۂ قادیانیت کے خلاف ۱۹۹۷ء میں ندوۃ العلماء لکھنوء میں ایک عالمی اجتماع منعقد ہوا جس کے انتظام و انصرام میں مولانا ابوالحسن علی ندویؒ پیش پیش تھے۔ اجلاس کی صدارت حرمین شریفین مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے منتظم

اعلیٰ شیخ محمد بن عبداللہ السبیل نے کی۔ بے شمار مندوب عرب ممالک سے تشریف لائے جس کی بناء پر اس عظیم الشان اجتماع میں عرب وعجم کے درمیان اخوت کی بہترین مثال نظر آتی تھی۔ مقامی لوگوں کی سہولت کے لیے عربی تقاریر کو اردو میں ترجمہ کرنے کا خصوصی اہتمام کیا گیا تا کہ ان عرب مندوبین کے افکار ونظریات کو بہتر طور پر سمجھا جا سکے۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ اس تاریخی اجتماع کی منظر کشی کرتے ہوئے رقمطراز ہوتے ہیں:

''ان حضرات کی آمد نے اجلاس کو ایسا بنا دیا جیسے کسی عرب ملک میں ہو رہا ہو۔ اس کی کاروائیاں بھی عربی میں ہوتی رہیں جن کا ترجمہ اُردو میں کیا جاتا تھا اور اُردو کا عربی میں۔ ہندوستان کے تقریباً تمام ہی صوبوں کے علماء ومفکرین، مدارس اسلامیہ اور قدیم وجدید دارالعلوموں کے مہتمم اور دینی دعوت کے تجربہ کار اور بحث وتحقیق کے شناور تشریف فرما تھے۔ تقریباً ۱۷ ملکوں کی نمائندگی تھی۔''(۴۳)

تدریس عربی کی ترغیب:

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ اس ساری صورتِ حال سے واقف وآگاہ ہونے کے باوجود عربی زبان وادب کے طلبہ کو مایوس ہونے کی بجائے پُرعزم رہنے اور علم وعمل کے ذریعہ اپنی ذات میں کمال پیدا کرنے کی تلقین کرتے تھے۔ کیونکہ ہر زمانہ میں عروج اور مرتبہ انہی اشخاص کو ملتا ہے جنہوں نے لگن اور جستجو کے ذریعہ منزل کو پانے کے لیے تگ ودو کی۔ زمانہ ہر وقت خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتا ہے۔ اسلاف میں جو نامور شخصیات نے نام کمایا ہے تو اپنی جدوجہد سے۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ عربی زبان وادب کے طلبہ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں:

''انسان کا ذاتی جوہر اور اس کی قابلیت ہی وہ چیز ہے جو ہر وقت اور ہر زمانے میں اس کی ترقی کا واحد ذریعہ ہے۔ اگر آپ نے ان تینوں چیزوں یعنی اخلاص، جذبۂ قربانی اور ذاتی جوہر حاصل کر لیا ہے تو زمانہ آپ کے لیے بدلا بالکل نہیں ہے اور ہر وقت آپ کے لیے چشم براہ ہے۔ لیکن ان صفات سے اگر کوئی خالی ہے تو وہ جہاں بھی جائے گا اور جس جگہ کی بھی سند یا ڈگری اس کے پاس ہو گی، حالات کو بدلا ہوا اور اپنے مخالف پائے گا۔ پھر میں کہتا ہوں کہ اگر آپ نے یہ صفات اپنے اندر پیدا کر لیں تو آپ کے لیے عالمگیر کا زمانہ، نظام الملک طوسی کا زمانہ اور امام غزالیؒ، امام رازیؒ، امام ابن قیمؒ اور امام ابن تیمیہؒ کا زمانہ آج بھی منتظر ہے اور وہ آپ کے لیے واپس ہو سکتا ہے۔ یہ غلط ہے کہ زمانے میں کوئی جگہ پہلے سے خالی ہو اور وہ کسی کے لیے منتظر ہو کہ جب وہ شخص فارغ ہو لے گا تو اس کو وہ جگہ مل جائے گی۔ زمانہ ''بقائے اصلح'' کا قائل ہے۔ وہ بہت ہی حساس اور نقاد ہے۔ وہ صالح کی بجائے اصلح اور نافع کی بجائے انفع کو ترجیح دیتا ہے۔ لہٰذا اگر آپ اپنے اندر یہ

چیزیں ہیں تو ہر وقت زمانہ آپ کا ہے۔'' (۴۴)

اکثر اوقات ایسے ہوتا ہے کہ طالب علم عربی زبان کے قواعدِ صرف ونحو تو سیکھ لیتے ہیں مگر صحیح عربی لکھ سکتے نہ بول سکتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات تو عبارت بھی غلط پڑھتے ہیں۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کے بقول انہوں نے پیرا کی کا فن پانی سے باہر سیکھا ہے۔ جب ان کو دریا میں گھسنے کا موقع ملتا ہے تو اصولِ شناوری جو انہوں نے نظری طور پر سیکھے تھے کام نہیں آتے۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ خواہش مند تھے کہ طلبہ اپنی عمر کا طویل حصہ صرف ونحو کے قواعد سیکھنے کی بجائے عربی زبان میں تحریر وتقریر کا فن سیکھیں اور تصنیف وتالیف کی مہارت حاصل کریں جس کی بنا پر انہیں اپنا مافی الضمیر عربی زبان میں بیان کرنے میں سہولت ہو، فرماتے ہیں:

''اگر آپ محنت سے پڑھیں گے اور خاص طور پر عربی زبان اور عربی و دینی علوم میں آپ یہاں رہ کر پختگی پیدا کریں گے تو پھر جامعہ، چاہے اس کی بڑی بڑی عمارتیں نہ ہوں، اور جامعہ کی شان نظر نہ آتی ہو تو کچھ حرج نہیں، آپ جامعہ ہیں۔'' (۴۵)

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی عرب زبان وادب میں مہارت اور اس کی اشاعت وترویج میں کی جانے والی کاوشوں کو عرب وعجم میں بہت سراہا گیا۔ نامور استاذ اور محقق ڈاکٹر ظہور احمد اظہر، مولانا ابوالحسن علی ندوی کی عربی زبان وادب کے فروغ اور درس وتدریس کے لیے خدمات کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''مولانا ابوالحسن علی ندوی کے حوالے سے ایک بات ہمیشہ یاد رکھی جائے گی اور اس کو تاریخ میں کبھی کوئی چیلنج نہیں کر سکے گا۔ وہ یہ ہے کہ اسلام کی چودہ صدیوں میں برصغیر میں عربی ادب کا اتنا بڑا ادیب کبھی پیدا نہیں ہوا۔ عربی زبان میں جو طرز انشاء اور اسلوب نگارش مولانا نے اپنایا ہے وہ ایسا ہے کہ اُسے سہل ممتنع کہا جا سکتا ہے۔'' (۴۶)

اسی طرح مشہور ماہر تعلیم اور محقق ڈاکٹر محمود احمد غازی، مولانا کی عربی زبان پر مہارت وقدرت کا اعتراف اِن الفاظ میں کرتے ہیں:

''مولانا اُردو زبان کے تو صاحبِ طرز ادیب تھے ہی وہ عربی کے بھی بہت اعلیٰ پائے کے ادیب تھے۔ انہوں نے مولانا ندوی کی عربی تحریر ڈاکٹر طٰہٰ حسین، احمد امین اور سید قطب شہید کے پائے اور انہی کے معیار کی ہے۔ بلکہ بعض پہلوؤں سے ان سے بھی بڑھ کر ہے۔'' (۴۷)

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی ان تحریروں اور ان پر تبصروں سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہوتی ہے کہ عربی زبان ام السنہ ہے۔ اور بحیثیت مسلمان اس زبان کو پڑھنا، سمجھنا اور بولنا کس قدر ضروری ہے۔ ورنہ قرآن و

حدیث کا صحیح فہم و ادراک بھی بہت مشکل ہے۔ انہی باتوں کو پیش نظر رکھ کر مولانا نے اس کی اشاعت و ترویج میں بھرپور کردار ادا کیا۔

حوالہ جات وحواشی

(۱) ندوی، سید ابوالحسن علی، کاروان زندگی حصہ سوم، (کراچی: مجلس نشریات اسلام، س ن)، ص: ۱۶

(۲) ندوی، سید ابوالحسن علی، کاروان زندگی حصہ اوّل، (کراچی: مجلس نشریات اسلام، س ن)، ص: ۸۸۔۸۹

(۳) ایضاً، ص: ۸۹۔۹۰

(۴) ندوی، سید ابوالحسن علی، نبی ءرحمت، (کراچی: مجلس نشریات اسلام، س ن)، ص: ۱۷۔۱۸

(۵) ندوی، سید ابوالحسن علی، کاروان زندگی حصہ دوم، (کراچی: مجلس نشریات اسلام، س ن)، ص: ۸۴

(۶) ندوی، سید ابوالحسن علی، مطالعہ قرآن کے مبادی و اصول (کراچی: مجلس نشریات اسلام، س ن) ص ۱۰

(۷) قاسمی، مولانا محمد اسجد، حضرت مولانا علی میاں کی ادبی خدمات و تصنیفات، کاروان ادب (لکھنوء: صدر دفتر رابطہ ادب اسلامی عالمی، اپریل ۲۰۰۱ء۔مارچ ۲۰۰۲ء) ج ۸، شمارہ ۱۔۴، ص ۵۴

(۸) ندوی، سید ابوالحسن علی، دعوت و تبلیغ کا معجزانہ اسلوب (کراچی: مجلس نشریات اسلام، س ن) ص ۱۰

(۹) ایضاً

(۱۰) ندوی، سید ابوالحسن علی، کاروان زندگی حصہ ہفتم، (کراچی: مجلس نشریات اسلام، س ن)، ص: ۳۹۔۴۰

(۱۱) ندوی، سید ابوالحسن علی، کاروان زندگی حصہ ششم، ص: ۳۱۹۔۳۲۰

(۱۲) قاسمی، مولانا محمد اسجد، حضرت مولانا علی میاں کی ادبی خدمات و تصنیفات، کاروان ادب، حوالہ مذکور، ص: ۵۵

(۱۳) ایضاً، ص ۵۶

(۱۴) اعظمی، ڈاکٹر سعید الرحمٰن، بچوں کے ادب میں حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی کا اسلوب، کاروانِ ادب (لکھنوء: صدر دفتر رابطہ ادب اسلامی عالمی، اپریل ۲۰۰۱ء۔مارچ ۲۰۰۲ء) ج ۸، شمارہ ۱۔۴، ص ۲۴۸

(۱۵) حوالۂ مذکور، ص ۵۶

(۱۶) ندوی، محمد اقبال حسین، ڈاکٹر، مولانا علی میاں اور ادب اطفال، کاروان ادب، (لکھنوء: صدر دفتر رابطہ ادب اسلامی عالمی، اپریل ۲۰۰۱ء۔مارچ ۲۰۰۲ء) ص ۲۷۰

(۱۷) اعظمی، ڈاکٹر سعید الرحمٰن، بچوں کے ادب میں حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی کا اسلوب، کاروانِ ادب (لکھنوء: صدر دفتر رابطہ ادب اسلامی عالمی، اپریل ۲۰۰۱ء۔ مارچ ۲۰۰۲ء) ج ۸، شمارہ ۱۔۴، ص ۲۴۷
(۱۸) قاسمی، مولانا محمد اسجد، حضرت مولانا علی میاں کی ادبی خدمات وتصنیفات، کاروان ادب، حوالۂ مذکور، ص ۵۷
(۱۹) قاسمی، مولانا محمد اسجد، حضرت مولانا علی میاں کی ادبی خدمات وتصنیفات، کاروان ادب (حوالہ مذکور، ص ۵۹
(۲۰) عارف جنید، اسلام کی نشأۃ ثانیہ میں حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی کا قائدانہ کردار، ص ۱۰۳
(۲۱) ندوی، محمد اقبال حسین، ڈاکٹر، مولانا علی میاں اور ادب اطفال، کاروان ادب، (لکھنوء: صدر دفتر رابطہ ادب اسلامی عالمی، اپریل ۲۰۰۱ء۔ مارچ ۲۰۰۲ء) ص ۲۷۷
(۲۲) قاسمی، مولانا محمد اسجد، حضرت مولانا علی میاں کی ادبی خدمات وتصنیفات، حوالہ مذکور، ص ۴۷
(۲۳) اعظمی، ڈاکٹر سعید الرحمٰن، بچوں کے ادب میں حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی کا اسلوب، (لکھنوء: صدر دفتر رابطہ ادب اسلامی عالمی، اپریل ۲۰۰۱ء۔ مارچ ۲۰۰۲ء) ص ۲۲۱
(۲۴) عارف عزیز، مفکر اسلام اپنی فکر ونظر کے آئینہ میں، (لکھنوء: صدر دفتر رابطہ ادب اسلامی عالمی، اپریل ۲۰۰۱ء۔ مارچ ۲۰۰۲ء) ج ۸، شمارہ ۱۔۴، ص ۱۳۴
(۲۵) عارف جنید، اسلام کی نشأۃ ثانیہ میں حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی کا قائدانہ کردار، (لکھنوء: صدر دفتر رابطہ ادب اسلامی عالمی، اپریل ۲۰۰۱ء۔ مارچ ۲۰۰۲ء) ج ۸، شمارہ ۱۔۴، ص ۱۰۴
(۲۶) ندوی، سید ابوالحسن علی، پاجا سراغ زندگی، (کراچی: مجلس نشریات اسلام، س ن)، ص: ۱۲۲
(۲۷) ندوی، سید ابوالحسن علی، کاروان زندگی حصہ دوم، ص: ۳۲۹
(۲۸) ندوی، سید ابوالحسن علی، پاجا سراغ زندگی، ص: ۹۴۔۹۵
(۲۹) ایضاً، ص: ۲۹۔۳۰
(۳۰) ایضاً، ص: ۱۵۰
(۳۱) ندوی، سید ابوالحسن علی، کاروان زندگی حصہ ششم، (کراچی: مجلس نشریات اسلام، س ن)، ص: ۳۲۷
(۳۲) قاسمی، مولانا محمد اسجد، حضرت مولانا علی میاں کی ادبی خدمات وتصنیفات، کاروان ادب (لکھنوء: صدر دفتر رابطہ ادب اسلامی عالمی، اپریل ۲۰۰۱ء۔ مارچ ۲۰۰۲ء) ج ۸، شمارہ ۱۔۴، ص ۷۱
(۳۳) ندوی، سید ابوالحسن علی، کاروان زندگی حصہ ششم، (کراچی: مجلس نشریات اسلام، س ن)، ص: ۳۲۷
(۴۴) ندوی، سید ابوالحسن علی، کاروان زندگی حصہ سوم، ص: ۱۶
(۳۵) ندوی، سید ابوالحسن علی، پاجا سراغ زندگی، (کراچی: مجلس نشریات اسلام، س ن)، ص: ۱۲۲
(۳۶) ایضاً، ص: ۱۷۰

(۳۷) ندوی، سید ابوالحسن علی، دریائے کابل سے دریائے یرموک تک، (کراچی: مجلس نشریات اسلام، س ن)، ص: ۱۳۰

(۳۸) ندوی، سید ابوالحسن علی، نبیؐ رحمت، ص: ۸۶

(۳۹) ندوی، سید ابوالحسن علی، انسانی دُنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر، (کراچی: مجلس نشریات اسلام، س ن)، ص: ۱۵۔۱۶

(۴۰) قاسمی، مولانا محمد اسجد، حضرت مولانا علی میاں کی ادبی خدمات وتصنیفات، حوالہ مذکور، ص ۷۴۔۷۵

(۴۱) ایضاً، ص: ۳۵۵

(۴۲) ندوی، سید ابوالحسن علی، کاروان زندگی حصہ ششم، ص: ۳۲۰

(۴۳) ندوی، سید ابوالحسن علی، کاروان زندگی حصہ ہفتم، ص: ۶۱

(۴۴) ندوی، سید ابوالحسن علی، پاجا سراغ زندگی، ص: ۲۲۔۲۳

(۴۵) ندوی، سید ابوالحسن علی، نشان منزل، (کراچی: مجلس نشریات اسلام، س ن)، ص: ۱۹

(۴۶) قافلہ ادب اسلامی، (لاہور: رابطہ ادب اسلامی پاکستان، فروری۔ جولائی ۲۰۰۰ء)، جلد ۱، شمارہ ۱، ص: ۲۰۱

(۴۷) ایضاً، ص: ۲۱

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆